ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

جامعات میں السنۂ شرقیہ کی تدریس: تاریخ؛ مسائل اور امکانات

In the making and propagation of Urdu language and Literature, Oriental Languages especially Arabic, Persian, Sanskrit & Hindi have played a dynamic role. For affective teaching of Urdu language and literature it is an urgent need to be familiar with the literature and formation of these languages. Teaching and understanding of these languages at the university level is of immense importance for the magnifying influence of Urdu Language and literature. In this article a brief history of teaching of Oriental Languages has been traced in the Indo Pakistan and those problems have been pointed out that are hindrance in the way of effective teaching of these languages. Moreover an attempt has been made to cope with those problems and their practicable solutions have been presented in a lucid way.

زبان انسان کا امتیازی وصف ہے۔اس وصف کے ذریعے وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتا ہے اور پھر خیال ، احساس اور جذبے کی تشکیل اور مؤثر ترسیل کے قرینے اس کی دسترس میں آجاتے ہیں۔ یوں فرد کی محدود دُنیا اجتماعیت کے بڑے دائرے میں شامل ہو جاتی ہے۔سماج کی تشکیل اور تعمیر زبان کی منت گزار ہے۔کوئی بھی سماج یا سماجی ادارہ زبان کے فیضان کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا۔تہذیب اور تمدن کے قالب میں بھی روح کی حیثیت زبان کو ہی حاصل ہے؛ کیوں کہ زبان وسیلۂ اظہار بھی ہے اور خیال وفکر کی کارگہ بھی۔انسانوں کے مختلف النوع اور ہمہ رنگ تجربات،احساسات اور خیالات زبان کے وسیلے سے عام ہو کر سماج،تہذیب اور تمدن کی ثروت میں اضافہ کرتے ہیں۔ زبان کی حیثیت ایک دریائے سبک خرام کی سی ہے۔جس طرح مختلف ندی نالوں کا پانی دریا میں شامل ہو کر اس کی روانی کو برقرار رکھتا ہے اسی طرح زبان کے ذخیرۂ لفظیات اور اظہار وبیان کے قرینوں میں مختلف زمانوں اور ذہنوں کا رنگ رس شامل ہو کر اس کے دائرۂ ابلاغ کو وسعت آشنا کرتا ہے۔زبان عہد بہ عہد کے تغیرات سے دوچار ہوتی ہے اُس کے پرانے ،ازکار رفتہ اور فرسودہ عناصر متروک قرار پاتے ہیں اور نئے،تازہ اور توانا عناصر اس کے وجود کا حصّہ بن کر اس کی اظہاری لیاقت کو دو چند کر دیتے ہیں۔

زندہ زبانیں ایک دوسرے سے اخذ واستفادہ کر کے ایک دوسرے کے لیے تقویت کا باعث بنتی ہیں۔ زبانوں کے اس اشتراکِ عمل سے لفظ ومعنی کے نئے تناظر،تفہیم وتجزیہ کے تازہ پیکر اور اظہار وبیان کے جدید اسالیب ہاتھ آتے ہیں۔ جامد اور محدود

زبانیں زیادہ دیر سماج کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتیں۔ وہ لوگوں کے درمیان رسمی مکالمے کا فریضہ تو کسی حد تک پورا کرتی رہتی ہیں مگر انسانوں کے جذبوں، خیالوں، خوابوں اور تمناؤں کو شعر وادب کے لباس میں ڈھالنے اور انھیں نقشِ بقا بنانے سے قاصر وعاجز رہتی ہیں۔ جمود اور محدودیت کا دیمک انھیں اندر سے چاٹ کر کھوکھلا کرتا رہتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ سماج کے منظر نامے سے دُور ہٹتی جاتی ہیں۔

اُردو اپنے صوتیاتی ڈھانچے اور ذخیرۂ لفظیات کے اعتبار سے بین الاقوامی مزاج کی حامل ہے۔ اس کی تعمیر وتشکیل میں مختلف زبانوں اور بولیوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت ،ہندی اور دوسری بولیوں اور پراکرتوں کے اشتراکِ عمل نے اسے بہت جلد ایک توانا اور مستحکم زبان کی حیثیت عطا کر دی،بعد کے سفر میں انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں سے اخذ و استفادے نے اس کے لسانی اور ادبی سرمائے کو مزید کشادگی بخشی ہے۔اُردو اگرچہ دوسری زبانوں کے اختلاط اور اشتراک سے متشکل ہوئی ہے تاہم اس کے باوصف وہ کسی ایک زبان کی مقلد یا تابعِ مہمل نہیں۔ دوسری زبانوں کے عمل دخل کے باوجود اس کا اپنا ایک منفرد لب ولہجہ اور مزاج ہے۔دوسری زبانوں سے اس نے بے پناہ فائدے حاصل کیے ہیں؛ بہ قول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> دیگر زبانوں کے اختلاط اور دخیل الفاظ کے طریقِ کار سے اُردو گھاٹے میں نہیں رہی بلکہ اس میں ایک ایسی وسعت، قوت اور روانی پیدا ہوگئی ہے کہ ادیب وشاعر کو ہر قسم کے خیالات کو نئے نئے ڈھنگ سے ادا کرنے اور صحیح وموزوں لفظ کے انتخاب میں جو سہولت ہے وہ شاید ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہ ہو۔مخلوط ہونے سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ نئے الفاظ بنانے اور ترکیب دینے کے لیے ایک وسیع میدان ہاتھ آجاتا ہے۔ایک ایسی زبان کے لیے جو علمی وادبی ہونے کی آرزو رکھتی ہے، یہ بہت بڑی چیز ہے۔[۱]

اُردو زبان کے ماضی کی تفہیم اور اس کے تشکیلی اور ارتقائی مراحل کی عہد بہ عہد داستان سے کامل آشنائی اُس وقت تک ممکن نہیں، جب تک اُن زبانوں اور بولیوں سے مکمل آگاہی اور واقفیت نہ ہو،جن کا رنگ رس اس کے خمیر میں گندھا ہوا ہے۔ اُردو کے اولین لسانی اور ادبی منظر نامے سے لے کر اس کے عہد بہ عہد ارتقائی مراحل تک جن زبانوں کا عمل دخل زیادہ نمایاں دکھائی دیتا ہے،اُن میں عربی ، فارسی اور ہندی(بہ شمول ہندوستانی بولیاں اور پراکرتیں) شامل ہیں۔تُرکی زبان کے اثرات بھی دکھائی پڑتے ہیں مگر اول الذکر زبانوں کی نسبت کم کم۔عربی مسلمانوں کی مذہبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے اس لحاظ سے اس نے براہِ راست بھی اُردو پر اپنے اثرات مرتب کیے اور فارسی کے وسیلے سے بھی۔عربی زبان کے مفردات ومرکبات اپنی اصل کے خلاف ،جن مفاہیم میں فارسی میں رواج پا گئے تھے،اُردو میں بھی اسی طرح استعمال ہونے لگے۔عربی کے اُردو پر اثرات مفردات ومرکبات کی حد تک ہیں؛ قواعد پر اس کے اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں،یہی حال تُرکی کا بھی ہے۔ البتہ فارسی اور ہندی زبانوں نے محض ذخیرۂ لفظیات کو متاثر نہیں کیا بلکہ اس کے قواعد پر بھی اثر انداز ہوئیں۔اس لحاظ سے اُردو پر عربی اور ترکی کی نسبت فارسی اور ہندی کے احسانات زیادہ ہیں۔

ہندوستان میں انگریزوں کے غلبے سے پیش تر اسلامی مدارس ومکاتب میں عربی اور فارسی کی تعلیم عام تھی۔فارسی ہندوستان میں آٹھ سو سال تک سرکاری اور درباری زبان کے منصب پر متمکن رہی۔مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری اقوام میں بھی فارسی اور عربی کی تحصیل کا عام رجحان پیدا ہوا۔ اسی طرح سنسکرت، ہندی اور دوسری ہندوستانی بولیوں اور پراکرتوں کے سیکھنے اور

فروغ دینے میں مسلمانوں نے دیگر ہندوستانیوں کی طرح جوش وخروش کے ساتھ حصّہ لیا۔اس زمانے میں ان زبانوں پر قدرت ودسترس علم وفضل کا نشان سمجھی جاتی تھی۔ان زبانوں کے علما وفضلا کی معاشرے میں عزت وتکریم کی جاتی ۔ سلاطینِ دہلی اور مغلیہ حکمرانوں کے عہد میں ایسے مکاتب ومدارس کو دربار سے خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ اساتذہ کے مشاہروں کا انتظام دربار اور امرا کے ذمے تھا۔عبدالرشید خاں اس عہد کے نظامِ تعلیم کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> سلاطینِ دہلی اور مغلوں کے دور میں مسلمانوں کی تعلیم کا ایک مبسوط نظام قائم تھا۔علما اور فضلا اس فریضے کو مقدس سمجھتے ہوئے باوقار انداز سے انجام دیتے تھے۔ اساتذہ معاشرے میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بیش تر کو بادشاہوں اور امرا کی طرف سے معقول وظائف اور مشاہرے دیے جاتے تھے۔ مسجد ایک مکتب کی حیثیت رکھتی تھی جہاں مذہب اور عربی، فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔[۲]

اس زمانے میں گھروں کا ماحول بھی السنۂ شرقیہ کی تحصیل میں معاون تھا ۔ بڑے بڑے اُردو شعرا بھی اپنے آپ کو منوانے کی خاطر فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اُردو شعرا کے جو تذکرے لکھے گئے ، ان کی زبان فارسی تھی۔ اس دور کے مکاتب ومدارس میں تدریسِ زبان کے جدید طریقے اور انداز تو نہیں تھے مگر ان کا اپنا طریقۂ تدریس تھا،جو کارگر تھا۔ان مکاتب ومدارس کے فارغ التحصیل عربی، فارسی اور دوسری زبانوں میں اظہار وبیان کی لیاقت رکھتے تھے۔زبان سکھانے کا پہلا مرحلہ اس زبان کی لفظیات سے طلبہ کو آشنا کرانا تھا،اس مقصد کے لیے بیسیوں منظوم نصاب لکھے گئے۔خالق باری،ایزد باری، اللہ باری، نصاب الصبیان اور واحد باری جیسے ناموں کے مختصر منظوم لغات عربی فارسی، ہندی ، ترکی اور دوسری مقامی بولیوں اور زبانوں کے الفاظ پر مشتمل ہوتے تھے، جن کا یاد کرنا آسان تھا۔دوسرا مرحلہ اس زبان کے قواعد کی تدریس پر مشتمل تھا۔عربی زبان کے قواعد کے لیے صرف اور نحو، معانی اور بیان کی مختصر کتابیں پڑھائی جاتی تھیں ۔ فارسی زبان کی مؤثر تحصیل کے لیے آمد نامے، مصدر نامے اور قواعد کی مختصر کتابیں نصاب کا حصّہ تھیں۔ ان کتابوں کو عام فہم اور آسان اسلوب میں تحریر کیا گیا تھا تاکہ ناواقفانِ زبان کو ان کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ تیسرا مرحلہ ادب کی تدریس پر مشتمل تھا۔ ان زبانوں کا منتخب ادبیاتِ عالیہ نصاب کا حصّہ تھا،سو زبان کے اسرار و رموز سے آشنا طلبہ ادبیات کے نمونوں سے لذت گیر ہوتے تھے۔یہ اہتمام صرف عربی اور فارسی کے لیے نہ تھا بلکہ سنسکرت اور دیگر مقامی زبانوں کی تدریس کے لیے ایسے طریقے مروج تھے۔ اکبرِ اعظم کے زمانے میں سنسکرت کی تعلیم پر خاص طور پر توجہ دی گئی۔عبدالرشید خاں، آئینِ اکبری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> سنسکرت کے طلبہ کے لیے بیاکرن، نیائے، بیدانت اور پاتنجلی (سنسکرت گرامر) کی تعلیم ضروری قرار دی گئی۔ ہر طالب علم کے لیے موجودہ ضروریات وعلوم کی تعلیم حاصل کرنا فرض کیا گیا۔[۳]

انگریزوں نے ہندوستان پر کامل غلبے کے بعد یہاں کی تعلیم میں دل چسپی لینا شروع کی۔انھوں نے عربی اور فارسی کے بجائے انگریزی زبان کو تعلیمی زبان بنانے کی کوششوں کا آغاز کیا تو مسلمان سراپا احتجاج بن گئے۔ان کا خیال تھا کہ عربی اور فارسی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں مثبت تعلیم دی ہی نہیں جا سکتی۔۱۸۴۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ حکم جاری کر کے عربی اور فارسی مکاتب پر ضربِ کاری لگانے کی کوشش کی کہ سرکاری دفتروں میں صرف انگریزی تعلیم یافتہ افراد کو ملازمت دی جائے گی۔ ہندوؤں

نے انگریزی تعلیم کی طرف رجوع کر کے اپنی حالت کو بہتر بنا لیا مگر مسلمان اپنے علوم اور ورثے سے چمٹے رہے اور یوں ان کی معاشی حالت کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی۔تاہم ان کے اس مسلسل احتجاج کے باعث بعد ازاں انگریزی حکومت ان زبانوں کی تدریس اور تعلیم کی طرف کُچھ کُچھ متوجہ ہوئی۔السنۂ شرقیہ کو سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانے کا اہتمام کیا گیا۔ان زبانوں کو اختیاری مضامین کی حیثیت دی گئی اور طلبہ عربی، فارسی، ہندی، بنگالی، پنجابی یا دوسری مقامی زبانوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکتے تھے۔انگریزی عہد میں جدید انداز کی گرامریں اور ریڈریں لکھی گئیں جن سے ان زبانوں کو سیکھنے اور جاننے میں آسانی پیدا ہوئی۔جامعات میں ایم اے کی سطح پر اُردو کی تدریس کے بنیاد گزار اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ اُردو میں اعلا سطح کی ڈگری حاصل کرنے والوں کے لیے عربی ،فارسی اور ہندی زبانوں سے کامل آشنائی ضروری ہے اوران سے بے اعتنائی اُردو ادب کے ایک بڑے حصے کی تفہیم میں رکاوٹ ہے۔ اس غرض سے السنۂ شرقیہ کے ایسے نصابات مرتب کیے گئے جن کی خواندگی کے بعدان زبانوں کے ادبیاتِ عالیہ سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اُردو کے ساتھ ان زبانوں کے تعلقات کی وضاحت ہو جاتی تھی۔زمانے کی تبدیلی اور تیز روی نے مذاقِ عام میں تبدیلی پیدا کر دی اور نئے علوم وفنون نے السنۂ شرقیہ اور قدیم مضامین سے نئی نسلوں کو دُور کرنے میں اہم کردار ادا کیا ۔اس کے نتیجے میں عربی، فارسی، ہندی اور دوسری مشرقی زبانوں کی تحصیل ''کارِ بے کاراں'' میں شمار کی جانے لگی۔گھروں کے ماحول میں بھی تبدیلی آئی اور عربی ،فارسی اور ہندی کے بجائے انگریزی پر زور دیا جانے لگا۔ السنۂ شرقیہ کے اساتذہ اور اس کے بہی خواہ پرانے اسالیب اور انداز سے چمٹے رہے ،تدریس کے جدید انداز اپنانے کی کہیں کوشش نہیں کی گئی ،اس وجہ سے بھی ان زبانوں سے دوری کا رجحان بڑھنے لگا۔

السنۂ شرقیہ کی تدریس کے حوالے سے جامعات کا موجودہ منظر نامہ کسی طرح بھی خوش کن اور خوش آیند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایم اے کی سطح پر السنۂ شرقیہ کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت حاصل ہے اور بس۔ عام طور پر طلبہ کو فارسی زبان وادب، عربی زبان و ادب یا ہندی زبان وادب میں سے کسی ایک مضمون کے چناؤ کا اختیار دیا جاتا ہے۔بعض جامعات میں ہندی زبان وادب کی تدریس کا کُچھ انتظام نہیں ،وہاں طلبہ عربی یا فارسی میں سے کسی ایک مضمون کا انتخاب کر سکتے ہیں؛ اسی طرح ہندوستان کی اکثر جامعات میں ایم اے اُردو کے طلبہ فارسی یا ہندی میں سے کسی ایک زبان کا انتخاب کر سکتے ہیں وہاں عربی زبان وادب کی تدریس کا کوئی انتظام نہیں۔بعض جامعات میں اختیاری مضامین کے گروپ میں عربی، فارسی یا ہندی الگ الگ مضامین کی صورت میں ہیں یوں ایک طالب علم بہ یک وقت السنۂ شرقیہ میں سے دو مضامین کا انتخاب کر سکتا ہے۔بعض جامعات میں بیرونی (پرائیویٹ) طلبہ کے لیے عربی وفارسی کا ایک ہی اختیاری پرچہ ہے۔جامعات نے السنۂ شرقیہ کے لیے اپنے اپنے نصاب مرتب کیے ہیں مگر اکثر وبیشتر ایک دوسرے کا چربہ ہیں۔ان نصابات میں عام طور پر مشاہیر شعرا وادبا کے نظم ونثر کے نمونے جمع کر دیے گئے ہیں اور زبان کے قواعد اور امتیازات کو یک سر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ادب کے ذریعے زبان سکھانے کا طریقہ اہلِ مشرق کی ایجاد ہے یا اہلِ مغرب کی، انتہائی فضول، پیچیدہ اور غیر مؤثر ہے۔ زبان کی مبادیات سے آشنائی کے بغیر ایک ادب پارے کی تفہیم کیوں کر ممکن ہے؟ اس طریقۂ کار کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ عبارت یا متن جو زبان کی تحصیل کا ایک ذریعہ ہے ،وہ مقصد بن جاتا ہے۔ کُچھ جامعات کے نصابات میں زبان کے قواعد اور گرامر کے اصول بھی شامل ہیں،یوں بہ ظاہر وہ ''زبان وادب'' دونوں کی لاج رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر قواعد اور گرامر کے اصول ایسے اسلوب اور انداز میں پیش کیے جاتے ہیں کہ طالب علم ان سے کُچھ کسبِ فیض

نہیں کر سکتا۔ زبان کے بنیادی قواعد غیر ضروری تفصیلات، مباحث اور مثالوں سے اتنے گراں بار ہوتے ہیں کہ انھیں دیکھتے ہی طلبہ کا شعلۂ شوق بُجھنے لگتا ہے۔نصابات کی خرابی کے بعد دوسرا بڑا مسئلہ السنۂ شرقیہ کے اساتذہ کی عدم دستیابی ہے۔عام طور پر کسی جامعہ کی اُردو فیکلٹی میں ہندی، فارسی یا عربی کے اساتذہ کا تقرر نہیں کیا جاتا۔ جن اُردو اساتذہ کا ان زبانوں میں سے کسی کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ہوتا ہے،انھیں یہ خدمت انجام دینی پڑتی ہے۔یہ کام وہ جذب وشوق یا اخلاص کے ساتھ پورا نہیں کرتے بلکہ بیگار سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس روشِ تدریس سے جو فائدہ ہونا ہے وہ اظہر من الشّمس ہے۔ بعض جامعات میں عربی، فارسی یا ہندی کی فیکلٹیوں سے اساتذہ کی خدمات مستعار لی جاتی ہیں۔ یہ مانگے کا اجالا بھی ذہن ونگاہ کی تاریکی کو دُور کرنے میں اکثر وبیشتر ناکام رہتا ہے۔ اس طرح کے اضافی اور بے اجر کاموں کو خوش دلی اور دیانت داری کے ساتھ انجام دینا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔السنۂ شرقیہ کے لیے عام طور پر ہفتے میں ایک دو کلاسیں مختص کی جاتی ہیں۔اس سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ اگلا سبق پڑھتے پڑھتے پچھلا فراموش ہو جاتا ہے۔یوں سارا سال سیاق اور سباق ایک دوسرے سے الگ الگ رہتے ہیں۔ تدریس کا طریقہ بھی وہی قدیم ،خوش آواز اور بلند آہنگ طلبہ سے سبق پڑھوایا جاتا ہے یا استاد خود سبق کی بلند خوانی کرتا ہے۔ اس خواندگی کے دوران میں مشکل الفاظ وتراکیب اور محاورات وغیرہ کے مفہوم ومعانی بیان کیے جاتے ہیں یا اشعار کی سیدھی سادی تشریح کرا دی جاتی ہے۔ایک ایسی زبان جس سے طلبہ کی معمولی سی وابستگی ہے،اس کے ادبیاتِ عالیہ کو یوں سرسری انداز میں پڑھنے سے وہ کیا حاصل کر سکتے ہیں؟ اس طریقۂ تدریس میں طالب علم کی حیثیت اکثر وبیش تر ایک سامع کی سی رہتی ہے۔استاد نسبتاً زیادہ فعال رہتا ہے۔عبارت کی خواندگی طالب علم کرے یا استاد ،ترجمہ کرنا،قواعد کی نشان دہی کرنا اور مشکلاتِ متن کی تسہیل کرنا استاد ہی کا کام ہوتا ہے۔طلبہ سُننے یا نوٹ کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔استاد غیر زبان کی عبارت پڑھ کر اس کا اپنی زبان میں ترجمہ کر دیتا ہے۔ اس طرح استاد اور طالب علم دونوں کو غیر زبان کے استعمال کا موقع بہت کم ملتا ہے۔قواعد وترجمے کے ذریعے تدریس کے طریقے کے حامیوں کا خیال ہے کہ بڑی سطح کی کلاسوں کے لیے یہ طریقہ نہایت عمدہ ہے۔ تاہم تعلیمی اعتبار سے اس طریقے کو بہت زیادہ نافع اور کارگر قرار نہیں دیا جا سکتا۔اس اندازِ تدریس کے نتیجے میں طلبہ السنۂ شرقیہ کا نصاب ختم کرنے کے بعد بھی زبان کا وقوف حاصل نہیں کر پاتے۔ان کی استعداد میں کُچھ اضافہ نہیں ہوتا۔ وہ اہم اسباق کے اُردو تراجم رٹ کر امتحان کے مرحلۂ سخت سے بہ آسانی گزر جاتے ہیں اور بس:

گر ہمی مکتب وہمی مُلا

کارِ طفلاں تمام خواہد شد

السنۂ شرقیہ کی تدریس کو مؤثر بنانے کے لیے جامعات میں بہت کُچھ تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے تو ان زبانوں کی تدریس کے مقاصد کا تعین نہایت ضروری ہے۔ زمانے اور مزاجوں کی تبدیلی کے باعث مقاصدِ تدریس بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔نصاب سازوں اور تعلیمی ماہرین پر لازم ہے کہ وہ موجودہ تناظر میں السنۂ شرقیہ کی تدریس کے مقاصد متعین کریں۔بغیر کسی واضح مقصد کے ماضی کی ایک روایت کو نبھائے جانا کسی طرح بھی درست نہیں۔نئی نسلوں کو اُردو سے جوڑنے اور ان میں السنۂ شرقیہ کی تشویق پیدا کرنے کے لیے فوری اقدامات کی ضرورت ہے، جیسے:

۱۔ جامعات میں السنۂ شرقیہ کو ایک مستقل اور لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے۔ طالب علم کو اختیار دیا جائے کہ وہ کسی ایک

مشرقی زبان کا انتخاب کر لے۔

۲۔ السنۂ شرقیہ کے نصابات میں جدید عہد کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کی جائیں۔نصاب کے زاید المعیاد اور پارینہ اجزا ختم کیے جائیں۔ زبان اور ادب میں تفریق کی جائے۔ زبان سکھانے پر زیادہ توجہ ہونی چاہیے کیوں کہ اگر طالب علم کسی زبان سے آشنا ہو جائے تو اس کے ادبیات سے وہ بقدرِ شوق وضرورت اکتساب کر سکتا ہے۔ اس لیے ایسے اسباق شاملِ نصاب ہونے چاہییں جو روزمرہ یا بول چال کی زبان سے جُڑے ہوئے ہوں۔ ان اسباق میں دل چسپی کی فضا پیدا کی جائے تا کہ طلبہ ذوق وشوق کے ساتھ ان کی تحصیل کر سکیں۔ براہِ راست طریقِ تدریس کو رواج دیا جائے ،جس میں طالب علم کی حیثیت محض سامع کی نہ ہو بلکہ وہ عملاً زبان بولنے کی مشق کرے تا کہ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے پر قادر ہو جائے۔

۳۔ جامعات کی اُردو فیکلٹی میں کم از کم دو ایسے اساتذہ کا تقرر کیا جائے جو السنۂ شرقیہ میں اعلا ڈگری رکھتے ہوں۔

۴۔ ہر جامعہ میں السنۂ شرقیہ کے لیے لینگویج لیبارٹری قائم کی جائے ؛ تا کہ طالب علم لیبارٹری میں موجود سمعی وبصری اور تکلمی آلات کی مدد سے زبان کے رسم الخط،مزاج، الفاظ کی ادائیگی اور زبان کی نزاکتوں سے واقفیت حاصل کر سکے۔

۵۔ ثانوی اور وسطانی درجوں میں السنۂ شرقیہ کی تدریس کے لیے فضا ہموار کی جائے تا کہ طلبہ ان چھوٹے درجوں میں زبان کا وقوف حاصل کر سکیں اور اعلا درجے میں انھیں اکتسابِ فیض میں آسانی ہو۔

السنۂ شرقیہ کی مؤثر تدریس کی ضرورت پہلے کی نسبت اب زیادہ ہے۔دُنیا بہت تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آ رہی ہے۔زبانیں ایک دوسرے سے زیادہ استفادہ کر کے اجنبیت کی فضا کو ختم کر رہی ہیں۔اُردو کی بقا اور استحکام کے لیے لازم ہے کہ ان زبانوں کے ساتھ اس کے تعلقات کو مضبوط بنایا جائے جن کا خون اس کی رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔اس کے لیے مقاصد واضح، نصاب سہل اور طریقۂ تدریس مؤثر اختیار کرنا پڑے گا؛ نظیری نیشا پوری نے کہا ہے:

درسِ ادیب گر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بہ مکتب آورد ،طفلِ گریز پائے را

حوالہ جات

۱۔ تدریسِ اُردو؛ اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان؛ ۱۹۸۶ء؛ ص ۱۲۔

۲۔ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا کردار؛ کراچی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس،۱۹۸۶ء؛ ص ۳۶۔

۳۔ ایضاً،ص ۳۸۔